خالد اختر بہ طور اردو تبصرہ نگار

Khalid Akhtar as Urdu Review Writer

ڈاکٹر تنزیلہ اسلم[i]

Abstract:

Like other Genres of Urdu literature review writing has also been introduced by Sir Sayyed. It has been given a significant position in the literature, in Hindustan. A considerable effort has also been seen to be put in, to make all of its features clear. Regarding this genre extensive debates exist. Starting from Sir Sayyed's Era up to the era Shams Ur Rehman Farooqi. Contrary to it, Maulvi Abdul Haqq is the only one in Pakistan to recognize the importance of Urdu Review writing but in Pakistan it has not been given the due appreciation which it deserved. Muhammad Khalid Akhtar is one of the few people to put in serious efforts to established importance of this genres back in 60s and 70s. The bench mark He set for review writing in Urdu literature is truly an eye catcher.

Keywords: *Muhammad Khalid Akhtar, Bibliophilism, Fanoon, Critical Sense, Novel, Humor, Travelogue, Review Writer.*

دیگر اصناف ادب کی طرح تبصرہ نگاری کی صنف سر سید کی بدولت ہی متعارف ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اردو تبصرہ نگاری کی صنف کو خاصی اہمیت ملی ہےوہیں پر اس صنفِ ادب کے خدوخال واضح کر نے کی سنجیدہ کو شش بھی نظر آتی ہے سر سید احمد خان کے عہد سے شمس رحمان فاروقی تک اس پر مختلف پہلوؤں سے مباحث مو جود ہیں۔ اس کے بر عکس پاکستان میں مو لوی عبدالحق واحد شخصیت ہیں جنھوں نے اردو تبصرہ نگاری کی صنف کی اہمیت کو سمجھا۔ تاہم پاکستان میں اردو تبصرہ نگاری کووہ پذیرائی نہ مل سکی جس کی یہ حق دارتھی۔ ساٹھ ، ستر کی دہائی میں چند ایک اصحاب نے سنجیدگی سے اس صنف ادب کو آگے بڑھایا جن میں محمد خالد اختر کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے انھوں نے اردو ادب میں تبصرہ نگاری کا جو معیار طے کیا وہ قابل توجہ ہے ان کے طے کر دہ اصول و قواعد اردو ادب میں اردو تبصرہ نگاری کو مضبوط بنیاد فراہم کر سکتے ہیں ، اور نئے مبصرین کے لیے مشعل راہ ثابت ہو ں گے۔

کلیدی الفاظ: خالد اختر ، تبصرہ نگاری ، فنون ، تنقیدی شعور ، ناول ، مزاح نگاری ، سفر نامہ "آج" ، تبصرہ نگار۔

اردو میں ادبی تبصرہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس کی اہمیت کو عہد حاضر میں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اس کے ذریعے معیاری ادب کو زیادہ سے زیادہ قارئین کی توجہ حاصل ہو سکتی ہے اور معاشرے کے باشعور افراد ادیب، شعراء اور ادب سے منسلک سبھی افراد معاشرے میں مثبت تبدیلی لا سکتے ہیں قوم کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ حسن عابد کے بقول :

"ادب کے ذریعے تبدیلی آہستہ روی سے آتی ہے۔"[۱]

دراصل اردو ادب میں تبصرہ نگاری کی صنف کو سر سید احمد خان نے متعارف کرایا۔ ۱۸۰۲ء میں Eden Burgh Review and Critical Journal کا اجرا ہوا تھا۔ اس رسالے کا مقصد یہ تھا کہ نئی شائع ہونے والی

[i] Independent Scholar from Ahmadpur East, District Bahawalpur.

کتب کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچایا جاسکے۔ اس رسالے کو بہت پذیرائی ملی۔ اسی رسالے کی مقبولیت سے متاثر ہو کر دو نئے رسالے جاری ہوئے:

1. Black Woods Magazine
2. Quarterly Review

سر سید اور ان کے رفقاء نے جو تبصرے تحریر کیے ان ہی رسائل کے اصول و ضوابط سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اخبار الہلال، میں محمد حسین آزاد کی رائے دیکھیے:

> "ریویو نویس پبلک کی طرف سے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے، وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کریں اور فلاں کتاب خریدیں۔"[۲]

تاہم جب اودھ پنچ میں تبصرہ نگاری کا آغاز ہوا تو جواب الجواب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا اور تبصرہ نگاری تنقیدی مباحث میں تبدیل ہو گئی۔ تبصرہ نگاری کا اصل مقصد غتر بود ہو گیا۔ اردو میں ادبی تبصرہ نگاری کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھارت میں اس صنف ادب پر بہت مباحث موجود ہیں جیسے تارا چند رستوگی، ظ، انصاری، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر رئیس انور، ظفر کمالی، جلیل قدوائی، پروفیسر محمود الہی، وجیب الرحمٰن اور شمس الرحمٰن فاروقی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس صنف ادب کے حوالے سے بہت پر مغز سوالات اٹھائے ہیں تبصرہ نگاری آرٹ ہے یہ مشق؟ اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ تبصرہ کیا ہے؟ اور تبصرہ نگار کے فرائض وغیرہ۔ اس کے برعکس مولوی عبدالحق نے مذکورہ صنف کو سنجیدگی سے لیا اور پاکستان میں اہم کتب پر تبصرے تحریر کرنے کی روایت نے جنم لیا ان کے تحریر کردہ تبصروں کو بہت پذیرائی ملی۔ ۱۹۲۱ء میں رسالہ "اردو" کا اجرا ہوا تو مولوی عبدالحق نے اس فن کو کمال تک پہنچایا۔ مولوی عبدالحق کے ہزاروں مدون اور غیر مدون تبصرے موجود ہیں۔ پچاس کی دہائی میں ان کے ہاں تبصرہ نگاری میں واضح کمی نظر آتی ہے اور ان کے تبصروں میں تنقید کا رنگ غالب آنے لگا تھا۔ "مولوی عبدالحق۔ ادبی ولسانی خدمات" میں خلیق انجم نے بھی تذکرہ کیا ہے کہ مولوی عبدالحق کے تبصروں میں خالص تنقیدی رنگ غالب ہے۔

قیام پاکستان سے لے کر کے اب تک جتنے بھی رسائل شائع ہوئے ان میں سے چند رسائل میں تبصرہ نگاری کے گوشے مخصوص تھے۔ نوے کی دہائی میں رسالہ "اردو" میں بھی تبصرہ نگاری کا رجحان ختم ہو

گیا۔ ہمایوں، عالمگیر، نگار، فنون، قومی زبان، داستان گو، لیل و نہار، جسارت، الحمرا میں تبصرہ نگاری کے فن کو زندہ رکھنے کا اہتمام نظر آتا ہے اس کے علاوہ اردو روز ناموں میں حریت، مشرق، ایکسپریس اور نوائے وقت سرِفہرست ہیں۔ اگر پاکستان کے بہترین تبصرہ نگاروں کا انتخاب کیا جائے تو محمد خالد اختر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے تحریر کردہ تبصرے نئے مبصرین کے لیے مشعل راہ ہیں۔ محمد خالد اختر کا دعویٰ ہے :

> ”مجھے کتابوں پر ریویو لکھنے پر ملکہ حاصل ہے اور انھیں پڑھے بغیر ہی ریویو لکھ سکتا ہوں۔ یہ خدا کی دین ہے۔ جس طرح بعض لوگ پیدائشی افسانہ نویس ہوتے ہیں غالباً میں ایک پیدائشی تبصرہ نگار ہوں۔“[۳]

محمد خالد اختر ۲۳ جنوری ۱۹۱۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ جس کی موجودہ تحصیل لیاقت پور اور ضلع رحیم یار خان ہے۔ ان کے والد مولوی اختر علی ملازمت پیشہ تھے۔ ریونیو آفیسر ہونے کی وجہ سے مختلف شہروں میں مقیم رہے۔ آپ کے دادا مولوی عبدالمالک عربی، فارسی کتب کے مصنف تھے۔ مطلب انھوں نے ایک پڑھے لکھے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ انھوں نے اپنا بچپن بہاول نگر میں گزارا اور ابتدائی تعلیم بہاول پور سے حاصل کی۔

صادق ایجرٹن کالج میں محمد خالد اختر کی دوستی احمد ندیم قاسمی سے ہوئی اور ان کی دوستی کی وجہ سے مختلف رسائل میں ہلکا پھلکا لکھنا شروع کیا اور پھر وہ ایک قدآور ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھوں نے ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی اور شہرت حاصل کی۔ ان تصانیف کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ محمد خالد اختر کے ادبی قد کاٹھ کا اندازہ رہے۔

1۔	بیس سو گیارہ	ناول	۱۹۵۰ء
2۔	چاکیواڑہ میں وصال	ناول	۱۹۶۴ء
3۔	کھویا ہوا افق	مضامین	۱۹۶۸ء
4۔	دو سفر	سفر نامہ	۱۹۸۴ء
5۔	چچا عبدالباقی	مزاح	۱۹۸۵ء
6۔	مکاتیب خضر	خطوط	۱۹۸۹ء
7-	یاترا	سفر نامہ	۱۹۹۰ء

8-	ابن جبیر کا سفر	سفر نامہ	۱۹۹۵ء
9-	لالٹین اور دوسری کہانیاں	کہانیاں	۱۹۹۷ء
10-	کلی منجاروں کی برفیں	منتخب ترجمے	۲۰۰۸ء
11-	ریت پر لکیریں	خاکے	۲۰۱۱ء

انھوں نے بہت کم لکھا تاہم جو لکھا خوب لکھا۔ ان کی تخلیقی و ادبی خدمات کو موضوع تحقیق بھی بنایا گیا ہے۔ ۲۰۰۶ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر ان کے تخلیقی کارناموں اور ان کی شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اشفاق احمد ورک نے ایم۔ اے کی سطح پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ ان کی مزاح نگاری، سفر نامہ نگاری، ناول نگاری اور کہانیوں کو تو اکثر موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ لیکن تبصرہ نگاری کے حوالے سے ان کے کام کو وہ پذیرائی نہیں ملی جس کے وہ حق دار تھے۔ تبصرہ نگاری کے میدان میں ان کی تنقیدی نگاہ، مشاہداتی قوت اور وسیع مطالعہ کے ثبوت ملتے ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب کا شیدائی کسی فن پارے کی بہترین جانچ کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اور فنِ تبصرہ نگاری براہِ راست انگریزی ادب سے اردو ادب میں آیا۔ اور محمد خالد اختر کا انگریزی ادب سے بہت گہرا ناتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی نے "فنون" میں غیر روایتی تبصرہ نگاری کی طرح ڈالی۔ محمد کاظم اور خالد اختر کو یہ ذمہ داری سونپی۔ احمد ندیم قاسمی نے یہاں کچھ اصول طے کیے کہ کتاب کس قدر ضخیم ہو مکمل مطالعے کے بعد ہی تبصرہ تحریر کیا جائے گا کتاب کا ہر پہلو تبصرہ نگار کے سامنے ہو اور دوسرا اصول یہ تھا کہ قطعی طور پر معروضی انداز اختیار کیا جائے گا۔ اور تیسرا اصول یہ تھا کہ اسلوب دل چسپ ہونا چاہیے، تاکہ تبصرہ قاری کو کتاب کے مطالعے پر اکسائے۔

محمد خالد اختر کے سامنے تبصرہ نگاری کی ایسی کوئی مثال نہیں تھی۔ "سنڈے ٹائمز" اور "سنڈے ابزرویشن" میں جو تبصرہ نگاری کے نمونے ملتے تھے وہ کسی حد تک ان اصولوں کا احاطہ کرتے تھے۔ محتاط انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انگریزی میگزین سے تبصرہ نگاری کا فن سیکھا اور کہیں نہ کہیں یہ فن ان کی طبعیت سے مطابقت بھی رکھتا تھا۔ محمد خالد اختر کے تبصرے "ادبِ لطیف، " سویرا، " افکار، " لیل و نہار، " نقش، " تخلیق" اور فنون میں شائع ہوئے۔ "فنون" کے علاوہ سبھی تبصرے روایتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ "فنون" میں شائع ہونے والے تبصرے ادبی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ محمد خالد اختر نے کل (۴۰)

تبصرے تحریر کیے ہیں۔

"آج" کے مدیر اجمل کمال نے "فنون" میں شائع ہونے والے تقریباً تمام تبصروں کو کتابی شکل میں یکجا کر دیا ہے۔ صرف (۴) کتب پر تحریر کردہ تبصرے شامل ہونے سے رہ گئے ہیں ایک مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "زرِ گزشت اور دوسرا اندھیری رات کا تنہا مسافر (ناول) شہزاد منظر تیسرا صغیر اصغر جارچوی کی کتاب "ناقابلِ اشاعت پر چوتھا صغیر اصغر جارچوی کی ہی کتاب "اناپ شناپ پر ہے۔

محمد خالد اختر کے تحریر کردہ تبصروں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ تبصرے جو فنون میں شائع ہوئے وہ تمام تبصرے روایتی انداز سے ہٹ کر تحریر کیے گئے ہیں۔ روایتی انداز میں تحریر کیے جانے والے تبصرے تقریظ کی ہی شکل میں تحریر کیے جاتے ہیں اگر تبصرہ نگار تعریف سے ہٹ کر بات کرے تو تنقید کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ یہ دونوں اسلوب تبصرہ نگاری کی نفی کرتے ہیں تبصرہ نگاری کی روح قاری کو کسی کتاب کے مطالعے پر مائل کرنا ہے۔ محمد خالد اختر کے روایتی تبصرے نہایت اختصار سے تحریر کیے ہیں اور مصنف کا تعارف تو پیش کیا ہے لیکن کتاب کا تعارف بھی پیش نہیں کیا لیکن کتاب میں موجود تاریخی کوتاہیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا، اور یہ نشان دہی بھی کی ہے کہ ناول میں موجود جملے حرف بہ حرف پہلے بھی تحریر کردہ ناولوں میں موجود ہیں۔ اور اسی وجہ سے احساس نہیں رہتا کہ یہ طبع زاد ناول ہے یا مصنف کی ذاتی تخلیق ؟اور آخری کتاب کے حوالے سے صرف اتنا تحریر کیا ہے کہ یہ کتاب جنات کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ چوتھا تبصرہ "سویرا" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے۔ جو فاروق خالد کا ناول "سیاہ حاشیے" ہے۔ یہ تبصرہ بھی ایک پیراگراف کی شکل میں ہے۔ تکنیکی لحاظ سے گفتگو ہے نہ اسلوب پر روشنی ڈالی ہے اور نہ ہی موضوع کا تعارف ہے یہ تبصرہ کچھ اس طرح لکھا ہے کہ ناول کے اہم نکات کو نمایاں طور پر بیان کر دیا ہے جیسے:۔

1۔ یہ ایک لمبا اور کشادہ ناول ہے۔

2۔ الفاظ کے ریلے کے پیچھے دیو سی قوت ہے۔

3۔ نوجوان کا عجیب وژن ہے۔

4۔ شاید ایک گوتھک Gothic تیرگی کا احساس ہے۔

مختصر اور روایتی تبصرے ہونے کے باوجود خالد اختر کے ہاں جو تنقیدی رنگ ہے وہ معروضیت لیے ہوئے، یہی منفرد انداز آگے چل کر نمایاں اہمیت حاصل کرتا ہے جب معروضیت، بہترین اسلوب اور تنقیدی شعور یکجا ہو جاتا ہے۔ "افکار" میں شائع ہونے والے تبصروں میں اختر حامد خان کی خاکوں کی کتاب "چند بزرگ"۔ مذکورہ کتاب پر تبصرہ مفصل اگرچہ نہیں ہے۔ لیکن کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جیسے مبصر لکھتا ہے کہ اندازِ تحریر شاہد احمد دہلوی، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی جیسا ہی ہے۔ اس کے بعد ان تمام شخصیات کے نام تحریر کیے ہیں جن کے خاکے اس کتاب میں موجود ہیں اسے تعارفی تبصرہ کہا جاتا ہے۔ "افکار" اگست ۱۹۸۵ء میں چار کتابوں پر ان کے تبصرے شائع ہوئے۔

"افکار" ۱۹۸۶ء میں مشرف احمد کی کتاب "جب شہر بولتے ہیں" پر تبصرہ موجود ہے۔ مذکورہ کتاب پر تحریر کردہ تبصرے سے ایک کامیاب تبصرہ نگار کے نقوش ملتے ہیں۔ جیسے آغاز میں مبصر نے اسلوب کو پریم چند، منٹو اور غلام حسین کے مماثل قرار دے دیا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے لگن اور طویل مشق سے مختصر افسانے کا فن حاصل کیا ہے اور اس کے افسانے اپنا انفرادی رنگ نہیں لیے ہوئے۔ مبصر مزید لکھتا ہے کہ کہانیاں مکمل طور پر تحریری، حکایتی اور تمثیلی انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔ موپساں اور ماہم کی طرح ابتدا، وسط اور انجام کی کہانیاں نہیں ہیں۔ مجموعے کی بہترین کہانی "جب شہر بولتے ہیں" اور ناکام ترین کہانی "غار" ہے۔ جو انتظار حسین کے اتباع میں لکھی گئی ہے۔

مبصر نے کہانیوں کے دورانیے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۴ء کے دوران لکھی گئی ہیں۔ "افکار" مارچ ۱۹۸۹ء میں اور "ابنِ انشا احوال و آثار" ڈاکٹر ریاض احمد ریاض۔ "افکار" ۱۹۸۹ء میں ان کے تین تبصرے موجود ہیں۔ محمد خالد اختر نے ایسی کتب پر تبصرہ نگاری کو فوقیت دی ہے جو انفرادیت رکھتی ہیں۔ فیض احمد فیض کے تحریر کردہ مقالے کے حوالے سے انھوں نے خاص طور پر تبصرہ نگاری کی ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے یہاں ان کی فیض شناسی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تبصرہ نگار نے اس کتاب میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے وہ پورا واقعہ تحریر کیا یہ خاکہ مسترد ہو کر ردی کی ٹوکری میں ڈالا گیا، اور عبادت بریلوی نے اسے شائع کروایا اس تبصرے کا آخری جملہ دیکھیے کہ یونیورسٹی کے بقراطوں کی حماقت اور کج فہمی پر حیرت ہوتی ہے۔ "افکار" جنوری ۱۹۹۰ء فروری، جون، جولائی، اگست، نومبر اور دسمبر کے شماروں میں بھی

ان کے تبصرے موجود ہیں۔ افکار میں وہ "نئی کتابیں" کے عنوان سے تبصرے تحریر کرتے تھے۔ "افکار جون ۱۹۹۰ء" میں مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "آبِ گم" پر محمد خالد اختر کا منفرد تبصرہ موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مزاح نگاری مبصر کا پسندیدہ موضوع، مزاح سے متعلق کتب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اوصاف تبصرہ نگاری شوخ ہو جاتے ہیں۔ ان کے روایتی انداز میں بھی انفرادیت ہے جیسے آبِ گم کے نمایاں نکات بیان کر دیے یہی نکات قاری کو دعوت مطالعہ بھی دیتے ہیں۔ آبِ گم پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی پہلی سطر ملاحظہ ہو:

"اردو مزاح لکھنے والوں میں مشتاق احمد یوسفی کی شہرت اور اس میں کوئی شکن ہیں کہ وہ اس وقت ہمارے سب سے زیادہ دھرماتمہ نفیس مزاج لٹریری آرٹسٹ ہیں۔"[۴]

اور کتاب کے حوالے مبصر کی رائے کچھ اس طرح ہے کہ: آب گم ایک بم شیل ہے۔ الفاظ کا تاج محل ہے۔ پڑھنے والے کے لیے شاندار ضیافت ہے۔ ایک سطر بھی ایسی نہیں کہ جسے بے جان کہا جائے۔ یہ صرف مزاح نہیں اوریجنل طرز کا ناول ہے۔ ہر صفحے پر شادابی ہے۔ شفیق الرحمٰن کے علاوہ یوسفی (Quotable) مزاح نگار ہیں۔

اس کے بعد مبصر نے مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر سے تقابلی جائزہ لیا اور آبِ گم سے بہت سے جملے نمونے کے لیے بھی درج کیے ہیں مثلاً مور کو اگر شیو کر دیا جائے تو بالکل الو معلوم ہو۔ انگریز چارپائی استعمال نہیں کرتے۔ بولے ادوان کسنے سے جی چراتے ہیں۔ یہ ایک مفصل تشریحی تبصرہ ہے۔ اور یہاں ان کی کسی کی کوئی پابندی بھی نہیں تھی وہ ایک فطری تبصرہ نگار ہیں۔ یہاں ان کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے۔ "افکار ۱۹۹۱ء" مارچ، اپریل، جون، جولائی اور اگست میں بھی محمد خالد اختر کے تبصرے موجود ہیں۔ لیکن "فنون" میں احمد ندیم قاسمی کے طے کردہ اصولوں اور قوانین کے تحت اور سنڈے ٹائم سے تعلق کی وجہ سے جو تبصرے تحریر کیے گئے ہیں ان کی بدولت محمد خالد اختر نے اردو میں ادبی تبصرہ نگاری کے خدوخال وضع کر دیے ہیں۔ محمد خالد اختر نے زندگی کے آخری تیرہ برس میڈم زینت حسام اور اجمل کمال کے ساتھ گزارے۔ اجمل کمال نے "آج" میں "فنون" سے لیے گئے ۳۴ تبصروں کو شامل کیا ہے ان میں سے چند معروف کتب پر تحریر کردہ تبصروں کا جائزہ لیا ہے تاکہ محمد خالد اختر کے منفرد اسلوب تبصرہ نگاری کو قاری کے سامنے لایا جاسکے۔

محمد خالد اختر کے غیر روایتی تبصرے کچھ خاص طے کردہ اصولوں کے تحت تحریر کیے گئے ہیں جن میں تبصرہ نگاری کی روح نظر آتی ہے۔ انھوں نے منتخب کتب پر تبصرے تحریر کیے ہیں۔ یہاں پر تبصرہ نگاری ایک آرٹ کے روپ میں نظر آرہی ہے۔ سات سمندر پار، اختر ریاض الدین احمد آغاز میں سفر نامہ نگاری کے حوالے سے بہترین تنقیدی مضمون لکھا ہے۔ مطلب اگر قاری سات سمندر پار سے قبل اس مضمون کو پڑھتا ہے تو وہ خود بھی سفر نامے کی ادبی حیثیت کا تعین کر سکے گا۔

مبصر کے نزدیک آخری پیمانہ انگریزی ادب ہی ہے۔ یہاں پر بھی وہ کہتے ہیں کہ اردو میں لیونگرو نہیں ہماری قوم میں غالباً مہم جوئی اور ویگا بانڈ اسپرٹ اور تخیل کا فقدان ہے۔ محمود نظامی کے " نظر نامہ " کو مبصر سفر نامہ تسلیم نہیں کرتا " سات سمندر پار " کے بارے میں مبصر کا خیال ہے کہ :

"یہ ایک حقیقی سفری کتاب ہے۔ "[۵]

مبصر کی اس بات کو ماننا پڑتا ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک : اسلوب سادہ اور فرح بخش ہے۔ ٹوکیو، ماسکو اور دوسرے چند شہروں کے مرقعے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان گنت دل بستگیاں موجود ہیں۔ بات کہنے کے ڈھب میں لطافت اور چلبلا پن ہے۔

ایسا نہیں کہ مبصر نے کوتاہیوں کی نشاندہی نہیں کی، مبصر کے نزدیک مصنفہ ایک شخص، جگہ یا منظر کی کیفیت بخوبی (Evoke) کر لیتی ہیں۔ لیکن بعض جگہ عبارت آرائی پر بھی اتر آتی ہیں۔ املا کی اغلاط کی بھی نشان دہی کی ہے۔ جس کی وجہ سے اتنی اچھی کتاب کا مدعا ہی غتر بود ہو گیا ہے۔ تبصرہ نگار نے انتظار حسین اور مولانا صلاح الدین کے تحریر کردہ فلیپ کو بھی سخت ناپسند کیا ہے :

”اختر ریاض الدین دو جغادری ادیبوں کے نعرہ ہائے تحسین اور چیئرز کے شور میں ادبی اکھاڑے میں اتری ہیں۔۔۔۔۔ اعانت اور سفارش کے بغیر بھی آتیں تو ہم نظر انداز نہ کر سکتے۔ “[۶]

مبصر کے نزدیک ایک مصنف کو اپنی تخلیق کے بل بوتے پر خود کو منوانا چاہیے۔ مصنفہ کے اسلوب کو پیش کرنے کے لیے مبصر نے سفر نامے سے چند جملے بھی مثال کے لیے تحریر کیے ہیں۔ جس سے مصنفہ کا لب و لہجہ قاری کے سامنے عیاں ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہی ہے کہ محمد خالد اختر

قاری کو تمام بحث میں اپنے ساتھ شامل رکھتا ہے۔ اور شعوری طور پر قاری مطالعے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ دوسری کتاب جو خالد اختر کے تبصرہ نگاری کے فن کو جانچنے کے لیے منتخب کی وہ عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" ہے۔ یہاں تبصرہ نگار اگرچہ تنقیدی شعور کا بھرپور اظہار کر رہا ہے لیکن ادبی و تخلیقی انداز میں۔ تبصرہ نگار لاشعوری طور پر اس خوف کے زیر اثر ہے کہ وہ ایک نامور ادیب کے فن پارے کی خامیاں پیش کرنے جا رہا ہے۔ مبصر آغاز میں محتاط انداز میں ہلکے مزاح کا تاثر لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے، لیکن مبصر کی ہر دلیل جان دار ہونے کے باوجود تاویلات میں لپٹی ہوئی ہے۔ جیسے وہ لکھتا ہے کہ عبداللہ حسین نے ایک مکمل دور کی سیاسی، تمدنی اور معاشی تاریخ سمونے کی سعی کی ہے۔ لیکن ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ رتن ناتھ سرشار نے بھی ایسا کیا ہے۔ اگرچہ اس کے ہاں وحدت کا فقدان ہے۔ یہ ایک مضبوط دلیل ہے۔ اس کے بعد "آگ کا دریا" کا حوالہ دیا ہے۔ اور ٹھیک ٹھاک ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مبصر کے نزدیک:

"ایک ناول میں اگر وہ ناول ہے حرکت کرتا ہوا، رستا ہوا گرم خون ہونا ضروری ہے۔"[۷]

مبصر کے ہاں تقابلی انداز غالب رہتا ہے۔ مغربی مصنفین کے ساتھ تقابلی جائزہ ضرور لیتا ہے جیسے اور تو اور جارج ایلیٹ، ایملی، شارلٹ برانٹے اور سیریزی ووڈ کے ناولوں کے کرداروں میں جنسی آگاہی کی سلگتی ہوئی لو موجود ہے۔ یہاں مبصر نے دعویٰ کیا ہے کہ "اداس نسلیں" قرۃالعین حیدر کے ناول "میرے ہی صنم خانے" کی کامیاب پیروڈی۔ یہ ایک بہت بڑی بات کہی گئی ہے۔ اسی لیے مبصر نے صفحات نمبر درج کر دیے ہیں اور وضاحت بھی دی ہے کہ بے شک ادبی سرقے کے مرتکب نہیں ہوئے لیکن مصنف کے پاس لکھنو کا (First Hand) نالج نہیں تھا اس لیے اس نے لازمی قرۃالعین کو پڑھا ہے۔ جب کہ حالی، نذیر احمد اور سرشار کو پڑھنا چاہیے تھا۔ مبصر کے نزدیک تحریر کے کچھ ٹکڑے واقعی (Brilliant) ہیں اور ناول نگار اپنی تحریروں میں حد درجہ (Proud) ہے۔ ادبی سرقے کے حوالے سے مبصر کی دلیل دیکھیے:

"ولیم شیکسپیر ایک دیدہ دلیر ڈھیٹ چور تھا۔"[۸]

بقول مبصر "اداس نسلیں" کے کردار جنسی غدود سے محروم معلوم ہوتے ہیں۔ حال آں کہ ایسا نہیں ہے۔ مشرق کی اپنی ثقافت ہے۔ مبصر کے نزدیک تمام واقعات ہمیں (Convince) نہیں کرتے۔ یہ

ناول ایک بافت سازی ہے بقول مبصر عبداللہ حسین پر قطعاً (Taboos) اور گھٹن کا سایہ نہیں۔ منٹو کو پڑھتے ہوئے چہرے پر ایک (Leer) کا احساس رہتا ہے، جیسے کہ رہا ہو میں نے تمھیں تمھاری (Complacency) میں سے ہلا دیا ہے۔ اس ناول کو تبصرہ نگار نے (Marathon) ناول کا نام دیا ہے۔ بعض جگہ لکھا کہ کاش اتنے جنسی جملے نہ لکھے ہوتے کہیں اس ناول کو James Michener کے "ہوائی" اور ڈاکٹر ژواگو کے "پاسٹر ناک" کا ہم پلہ ناول قرار دیتے۔ مبصر بلا شبہ یہاں پر اعتماد طریقے سے بات نہیں کر سکا باوجود اس کے کہ جو اعتراض کیا ہے وہ بالکل درست ہیں کہ "اداس نسلیں" ناول نہیں ناولائی ہوئی تاریخ ہے۔ ناول کا خاکہ وسیع اور شوریدہ ہے مگر رنگ پھیکے اور دھیمے ہیں۔ ناول میں تجسّس کی فضا موجود ہی نہیں۔ عنوان بالکل مناسب نہیں۔

اسی تبصرے میں "علی پور کا ایلی" کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ کالرج کے "قدیم سمندری آدمی" سے تقابلی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اگر پوری بحث میں سے "اداس نسلیں" پر کی گئی گفتگو کو الگ کر لیا جائے تو بہترین تبصرہ سامنے آتا ہے یہاں مبصر کی قاری کی تنقید شعور کی بھی تربیت کرتا نظر آتا ہے۔ خواتین ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں فرخندہ لودھی، نجمہ انوار الحق، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، الطاف فاطمہ کی تصانیف پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن جمیلہ ہاشمی کے ایک ناولٹ "آتشِ رفتہ" کے علاوہ خواتین کے لیے بہت سخت لہجہ اختیار کیا ہے۔ دو ٹوک الفاظ میں ان کے فن کی نفی کی ہے۔ بل کہ کوئی ناول ان کے طے کردہ پیمانوں پر پورا نہیں اترا۔ مثلاً فرخندہ لودھی کا ناول "حسرت عرضِ تمنا" کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ فرخندہ لودھی نے ایک برا ناول لکھا ہے۔"[9]

اسی طرح بانو قدسیہ کے افسانوی مجموعے "بازگشت" پر تبصرہ نگاری کرتے ہوئے مبصر بانو کو ناکام ناول نگار ثابت کرنے کے لیے کافی لمبی تمہید باندھی ہوئی ہے۔ مبصر کے بقول جو ناول معاشرے کی برائیوں کو بے نقاب کرے اور انسانیت کا درس دیں وہ برے لگتے ہیں مبصر نے "برا" لفظ خواتین کہانی کاروں کے لیے جیسے مخصوص کیا ہے۔ لیکن تبصرہ نگار کے فرض کو وہ یہاں بھولا نہیں ہے۔ اور جملہ دیکھیے کہ جن لوگوں کو حقیقی معاشرتی افسانے پسند ہیں وہ اسے خریدنے میں دیر نہ کریں اسی طرح الطاف فاطمہ کے ناول "دستک نہ دو" کے لیے پہلا جملہ ہی یہ لکھا ہے کہ بے چارا ناول گرداب میں ہے، اور ناول کے لیے مبصر کے خیالات:

"یہ ایک برا ناول ہے (excuse me ladies !)۔" (۱۰)

مبصر کو کتاب پسند ہو یا نہ ہو اپنے تبصرے کے لیے ضرور فکر مند ہے۔ اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کرتا۔ جیسے وہ لکھتا ہے کہ "دستک نہ دو" کا پلاٹ کیا ہے اس پر بحث نہیں کروں گا؟ کیوں کہ ایسا کرنے سے لوگوں میں شوق باقی نہیں رہتا۔ مبصر نے کہانی کا خلاصہ بھی تحریر کر دیا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ ناول کا موضوع خاموش محبت ہے۔ تبصرہ نگار نے الطاف فاطمہ سے گزارش بھی کی کہ آپ سے اولیور ٹوسٹ کی طرح مانگتے ہیں۔ اردو ناول کو کون بچائے گا؟ مبصر کے نزدیک یہ ناول فارغ وقت کے شغل کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں کٹے ہوئے، چھنے ہوئے، ابلے ہوئے سب پکانے کی ترکیب یہاں موجود ہے۔ مبصر کے نزدیک ایک اچھا ناول لکھنے کے لیے ڈگریوں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور دلیل دیکھیے وہ لکھتا ہے۔ Haworth Parsonage کی ایمیلی برانٹے "بنگال کی "پورنا دیوی کا مندر" لکھنو کی خدیجہ مستور کسی کالج کے ایوانوں سے نہیں گزری۔ "آنگن "کے بارے میں مبصر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ آخری ابواب کے علاوہ بہتر ناول ہے، "کہتے ہیں جس کو عشق" نجمہ انوار الحق کا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہاں پر تبصرہ نگار نے براہ راست افسانہ نگار خاتون کے اسلوب کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا بل کہ دیباچہ نگار اتنا سراہا کہ خود ہی لکھا ہے کہ چاہتے ہوئے بھی پورا دیباچہ نقل نہیں کیا۔ کیوں کہ اگر کسی نے دیباچہ پڑھ لیا تو کتاب نہیں خریدے گا۔ اور کہانیوں کے لیے لکھا ہے کہ دل کے بہلاوے کے لیے ہلکی پھلکی کہانیاں ہیں۔ ان تمام خواتین کہانی کاروں کے برعکس جمیلہ ہاشمی کی تصانیف پر تبصرہ نگاری کرتے ہوئے مبصر کا لہجہ بدل جاتا ہے جیسے جمیلہ ہاشمی کا ناولٹ "روہی" پر تبصرہ دیکھیے کہ مصنفہ روہی کے رومانس کو مسخر کرنے میں ضرور کامیاب ہوئی ہے جمیلہ ہاشمی پختہ کار داستان گو ہیں۔ تنقید بھی کس قدر نرمی سے کی گئی ہے۔ مصنوعی پلاٹ اور فلیٹ کرداروں کے باوجود روہی ناولٹ میں موجود ہے۔ روہی سے محبت کرنے والوں کے لیے اسے پڑھنا ضروری ہے۔ اور یہ کہ "روہی" کی تخلیق کے وقت رائیٹر مصنفہ کے ساتھ نہیں تھی۔ جمیلہ ہاشمی کی ایک اور کتاب "آتشِ رفتہ" جو ایک ناولٹ ہے؛ کے بارے میں مبصر نے لکھا ہے کہ:

"آتشِ رفتہ کی پہلی نمود نے ہمیں چونکا دیا ہے۔"[۱۱]

یہاں پر مبصر پہلی چند سطروں میں ہی تبصرہ نگاری کا ہدف حاصل کرلیتا ہے۔ عمومی افسردگی کے

دور میں یہ ناولٹ گویا بہار کا تازہ جھونکا تھا اور اپنی لطافتِ بیاں میں بالکل اچھوتا اور نیا نویلا تھا بل کہ مبصر نے لکھا کہ جو تصور اس ناولٹ میں ملتا ہے وہ منٹو کے افسانے "بو" میں بھی ملتا ہے۔ لاشعوری طور پر اس ناولٹ کو بڑا مقام دیا اور شعری کتاب "اپنا اپنا جہنم" بھی جمیلہ ہاشمی کی ہی تحریر کردہ ہے جس پر محمد خالد اختر کا تبصرہ موجود ہے یہاں پر تبصرہ نگار چاہ کر بھی تنقید نہیں کر پا رہا۔ کتاب کا تعارف پیش کرنے کے بعد مبصر لکھتا ہے کتاب میں موجود تینوں ناولٹوں کا تھیم اسلوب اور برتاؤ میں یک رنگی ہے۔ مبصر کے نزدیک زمان، مکان کا پتہ نہ ہونا تیسرے درجے کے ادیب کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔

لیکن جمیلہ ہاشمی ایک حقیقی لکھنے والی ہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے۔ نپولین کے جنگ کے دنوں میں لکھے ناولٹ "واٹرلو" یا بیٹل آف نائل کے معرکے کا کوئی ذکر نہیں۔ یہاں پر بھی براہ راست جمیلہ ہاشمی کو مخاطب کرکے اس غلطی کا احساس نہیں دلایا بل کہ پاکستان کے ادیبوں سے مخاطب ہو کر بات کی۔ ان کے تبصروں میں مشکل انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔ صرف اسی تبصرے میں دیکھ لیں:

☆ وہ اپنے تخلیقی ڈیمو کے ہاتھوں مجبور رہے۔
☆ پیچیدگی اور بہاؤ میں (Poursterin) غیر متوجہ اس طرزِ بیاں کے ساتھ قدم نہیں جا سکتا۔
☆ جو اس کے ساتھ چل سکا وہ سارے دیکھ سکتا ہے۔
☆ Curiosity کے طور پر مصنفہ سے پوچھا اردو ادب کے Politburo کے اہم ارکان میں جگہ حاصل کی ہے۔
☆ تمہاری جگہ Illustrious قطار کے وسط میں ہوگی
☆ ادبی شہرت Fickle سے ہے۔
☆ وقت کے عدم تعین سے ناول Fantastic لگتے ہیں۔
☆ اہم برتاؤ (Treatment) میں یک رنگی ہے۔

تیسرا اہم پہلو یہ نظر آتا ہے کہ محمد خالد اختر نے تبصرے کے لیے جن کتابوں کا چناؤ کیا ہے وہ حقیقت میں بہت مشہور ہوئیں ان تصانیف کا ایک مقام ہے۔ شعوری طور پر مبصر کی یہ خواہش رہی کہ زیادہ سے زیادہ قارئین ان کتابوں کا مطالعہ کریں اور ان کے نقائص کو بھی نمایاں کیا ہے۔ تاکہ قاری اپنی رائے بھی قائم کرے۔ مثال کے طور پر مختار مسعود کی کتاب "آوازِ دوست" مضامین کا مجموعہ ہے اس کتاب نے

بہت داد سمیٹی اور نصاب تعلیم کا حصہ بھی بن گئی یہاں تبصرہ نگار نے مختار مسعود کے اسلوب میں ہی تبصرہ تحریر کیا ہے:

''جنابِ عالی ! ادب بجالاتا ہوں آپ کی تصنیف کا رسالہ "آوازِ دوست" نظر نواز ہوا۔ سبحان اللہ ! نثری اردو کو لباسِ تکلف اور زیورِ سخن سے آراستہ کرکے روشنِ ماہ تمام بنایا ہے۔ ہزار کوشش سے شاہدِ معنی ہاتھ نہیں آتا۔''[۱۴]

مبصر حیران ہے کہ تصنع، بناوٹ اور بھاری بھر کم الفاظ کے ساتھ مختار مسعود کے مضامین کو کیسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ "اتنی تعریفوں کے بعد نوبل پرائز آسٹریلیا کے پیٹرک وائیٹ صاحب لے اڑے۔ وہ بھی منٹو کی طرح لکھتا ہے۔ تبصرہ نگار کا دوسرا اعتراض ہے کہ شخصیات کے چناؤ میں کون سا پیمانہ استعمال کیا ہے۔

1۔ اول آدمی کا مشہور و معزز ہونا

2۔ اس کا اہل اسلام ہونا، اہل اسلام سے محبت رکھنا

3۔ خوش پوش ہونا

4۔ جامعہ علی گڑھ کا سند یافتہ ہونا۔

تبصرہ نگار حیران ہے کہ اقبال کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ آٹو گراف تک میں دستخط کرتے۔ مزید لکھتا ہے کہ منٹو کے نزدیک بمبئی کی۔۔۔۔ موزیل عظیم عورت تھی۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے ''کپاس کا پھول'' نے بہت شہرت حاصل کی۔ محمد خالد اختر نے اسے بھی تبصرہ نگاری کے لیے منتخب کیا۔ جانبداری سے دامن چھڑانا واقعی مشکل ہے۔ محمد خالد اختر کے نزدیک ندیم قاسمی اور غلام عباس دونوں استادوں نے بے حد کم لکھا۔ ایسا نہیں کہ مبصر نے غلام عباس کے برابر احمد ندیم قاسمی کو رکھا۔ قاسمی کے افسانوں کے کمزور پہلو نمایاں کیے ہیں مگر لہجے نرم ہیں کہ ان کی کہانیوں میں کبھی کبھی شعریت آجاتی ہے۔ کیوں کہ وہ شاعر ہیں تو کہانیوں کا اسلوب ننگا بچا ہے، مزید لکھا ہے کہ lowkey میں لکھتا ہے۔ ان سب کے باوجود رابرٹ لوئی، اسٹیونسن کی کتابوں کی طرح کہانیوں کو جتنی بار پڑھو گرفت میں لے لیتی ہیں اس طرح انتظار حسین کا نام دنیا میں ادبی حوالے سے ایک بڑا نام ہے۔ ان کے ناول "بستی" پر ان تبصرہ ملتا ہے۔

مبصر کا پہلا سوال ہی کافی چبھتا ہوا ہے۔ کہ پہلے پچاس صفحات میں ناول کہاں ہے؟ مزید لکھتا ہے کہ میری رائے میں :

"' 'بستی' بے نصیب اردو ناول کے تابوت میں ایک اور کیل ہے۔" [۱۳]

دراصل تبصرہ نگار کے مطابق ناول کا جو مقام ہے، اس پر کوئی پاکستانی ناول پورا نہیں اترا۔ محمد خالد اختر نے ایک ناول "فاختہ" مستنصر حسین تارڑ کا بھی چنا ہے۔ مبصر کے نزدیک مستنصر حسین تارڑ، شفیق الرحمٰن کا چیلا ہے۔ "فاختہ" ایک طویل کہانی ہے، جب کہ مبصر کے نزدیک یہ ایک ناول ہے۔ تبصرہ نگار نے اسے Romanticized سفری روئیداد کہا ہے۔ اور اس کا ہیرو بھی تارڑ ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک افسانہ ناول میں جھوٹ کی اجازت ہوتی ہے۔ سفری ناول لکھنے کو یہ لائسنس حاصل نہیں ہوتا۔ تبصرہ نگار نے مستنصر حسین کو بہ طور سفر نامہ نگار بہت سراہا۔ اس کے علاوہ اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی "گردِ راہ" پر محمد خالد اختر کا تبصرہ موجود ہے۔ اس تصنیف نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔ تبصرہ نگار نے جن کتابوں پر تبصرے تحریر کیے وہ تمام تصانیف کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ مسعود مفتی کی کتاب "رگِ سنگ "غلام محی الدین کے ناول " کرنافلی "مستنصر حسین کے پنجابی ناول "پکھیرو "اکرام اللہ کی تصنیف " جنگل "اور منیر احمد شیخ کی کتاب " لمحے کی بات " پر بھی تبصرہ تحریر کیا ہے۔ لیکن مزاح نگاری کے حوالے سے مبصر نے جن کتابوں کا انتخاب کیا ہے وہ بہت مشہور ہوئیں۔ ابن انشا کی ہی کتاب "اردو ادب کی آخری کتاب "اور مشتاق احمد یوسفی کی "زرگزشت " کرنل محمد خان کی " بجنگ آمد " وغیرہ۔ ایسی اصناف پر مبصر نے جاندار تبصرے تحریر کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول اور افسانے کے بعد مزاح نگاری ایک ایسی صنف ہے جو مبصر کو مطالعے کی طرف مائل کرتی ہے اور تنقیدی پہلوؤں پر بہتر روشنی ڈالی ہے۔

ایسی کتابوں پر تبصرہ تحریر کرتے ہوئے تبصرہ نگار نے عبارت کے نمونے بھی درج کیے ہیں۔ نثر نگاری کے حوالے سے مبصر کا دعویٰ ہے کہ پچھلے تیس سالوں میں پطرس، منٹو، اور شفیق الرحمٰن سے بہتر اردو نثر کسی نے نہیں لکھی۔ اور ابنِ انشا نے جو دعویٰ کیا ہے کہ ہم عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں محمد خالد اختر نے اس کی نفی کی ہے، بل کہ مبصر کے خیال میں شفیق الرحمٰن کے ہوتے ہوئے کسی کو مبارک بادیاں دینا مناسب نہیں۔ مزید لکھتا ہے کہ فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، پطرس بخاری اور شفیق الرحمٰن سے بہتر

کوئی مزاح نگار بتائے گا تو اس سے زیادہ میری بلی کو علم ہے مزاح نگاری کا۔ محمد خالد اختر نے جب ایسے ناول تبصرے کے لیے منتخب کیے جن کا موضوع ایک جیسا تھا یا جن کا ادبی معیار ایک جیسا تھا انھیں "نئے ناولوں کی کھیپ" کے عنوان سے ایک ہی تبصرے میں سمو دیا ہے۔ ان تمام ناولوں کے لیے تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ یہ لکڑی کے ناول ہیں۔ روندی ہوئی زمین کو پھر روندا گیا ہے۔

مبصر کے نزدیک کسی بھی تخلیق کو اس کی وجہ سے مقام نہیں ملتا بل کہ تخلیق کسی کی بھی ہو اگر جان دار ہے تو ادب میں اسے جائز مقام ملنا چاہیے۔ مثلاً انھوں نے شہزاد منظر کے ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کو بہت سراہا ہے۔ کہ اس کہانی میں کہانی کار نے جنگ عظیم اور اس کے بعد کا بنگال پیش کیا ہے۔ ڈی ایچ لارنس، ارنسٹ ہیمنگوے کی یاد تازہ کرنے والا ناول ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ چبایا ہوا نوالہ نہیں ہے۔ محمد خالد اختر کے تحریر کردہ تبصروں کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں۔ جیسے حسن عسکری کی طرح غیر ملکی ادیبوں، مصنفوں کے ساتھ تقابلی جائزہ ضرور ملتا ہے۔ بعض جگہ معاشرت اور تہذیب کے فرق کو بھی خاطر میں نہیں لایا گیا۔ معروضیت بھرپور تبصرہ نگاری لیکن جمیلہ ہاشمی کے حوالے سے جانبداری نظر آتی ہے۔ تنقیدی شعور کے ساتھ تخلیقی رنگ بھی نمایاں ہے۔ انگریزی الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا ہے۔ لیکن محمد خالد اختر کے تحریر کردہ تبصرے مبصرین کے لیے راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے ۲ فروری ۲۰۰۲ء کو وفات پائی انھیں کراچی میں سپرد خاک کیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ حسن عابد، "تبصرہ"، مشمولہ: روزنامہ ایکسپریس (لاہور: ۲۷ مئی، ۲۰۰۴ء)، ۱۲۔

۲۔ مولانا محمد حسین آزاد، "تبصرہ"، مشمولہ: الہلال (کلکتہ: ۱۹ مارچ، ۱۹۱۳ء)۔

۳۔ محمد خالد اختر، "تبصرہ نگاری"، مشمولہ: ماہنامہ افکار (جنوری فروری ۱۹۹۵ء)، ۲۵۰۔

۴۔ محمد خالد اختر، "آب گم" (تبصرہ)، مشمولہ: شمارہ آج، ۵۲ (کراچی: ۲۰۰۵ء)، ۱۰۵۔

۵۔ محمد خالد اختر، "سات سمندر پار" (تبصرہ)، مشمولہ: شمارہ آج ۵۲ (کراچی: ۲۰۰۵ء) ۱۰۵۔

۶۔ محمد خالد اختر، "اداس نسلیں" (تبصرہ)، مشمولہ: آج ۵۲ (کراچی: ۲۰۰۵ء)، ۱۱۰۔

۷۔ ایضاً، ۱۰۵۔

۸۔ ایضاً، ۱۲۶۔

۹۔ محمد خالد اختر، ''حسرت عرض تمنا'' (تبصرہ)، مشمولہ : آج ۵۲ (کراچی : ۲۰۰۵ء)، ۱۲۹۔

۱۰۔ محمد خالد اختر، ''دستک نہ دو'' (تبصرہ)، مشمولہ: آج ۵۲ (کراچی : ۲۰۰۵ء)، ۲۵۰۔

۱۱۔ محمد خالد اختر، ''آتش رفتہ'' (تبصرہ)، مشمولہ: آج ۵۲ (کراچی : ۲۰۰۵ء)، ۱۸۰۔

۱۲۔ محمد خالد اختر، ''آوازِ دوست'' (تبصرہ)، مشمولہ : آج ۵۲ (کراچی : ۲۰۰۵ء)، ۱۸۵۔

۱۳۔ محمد خالد اختر، ''بستی'' (تبصرہ)، مشمولہ: آج ۵۲ (کراچی : ۲۰۰۵ء)، ۲۷۳۔